

ہونے میں سے نہ ہونے کی طرف مائل کشتنی میں چند بدلے پنچھے جسم اور ان کے چند لیلے سے بھرے  
محنتی ہاتھ اور ران کے سامنے ایک دبیع چنان۔ اتنی بڑی کہ سمندر کی جسامت کو بھی منقرض  
کرتی ہے مگر حکمت میں اور تباہی کی چینکار لیے شتیزیں کو ویران کر دینے کی قوت کے ساتھ۔ وہ  
اپنی جمیں آنکھوں سے دیکھتی ہے اُس نفطے کو جو کو کشتنی ہے اُس کے ساتھ مقابلے کی سی میں ہے  
اور اُسے نیست دنابود کرنے کے لیے آگے بڑھتی ہے۔

پہلا بھالا اس کے جسم میں صرف چھپتا ہے اور وہ ایک لاپردا کردہ بدل کر اسے جھنجھڑ  
دیتی ہے۔ دوسرا نیزہ کچھ دیر تک پریست رہتا ہے اور اُسے قدسے جھنجھلاتا ہے تیسرا  
دار اس کے شفاف بدن میں چھپھلتا ہوا زخم ڈال دیتا ہے۔ چوتھا نیزہ اُسی زخم میں سے  
خون کے پچھے قطرے کر دیتا ہے اور چھپکیں ایسا بھالا وہیل کے بدن میں کھبٹا ہے جو  
چھپنا ہرنے کے باوجود انسانی باندوں کی طاقت میں نہ کر سکتا ہے اور اس کے کروٹیں  
بدلتے، زیر آب جاتے اور رچنکارنے کے باوجود علیحدہ نہیں ہوتا۔ جسم سے خون کا، اس  
کی زندگی کا خراج وصول کرنا چلا جاتا ہے۔ اُدھر بھالے کے ساتھ بندھی ڈور وہیل کے  
وشی سفر کو ناپ رہی ہے کہ وہ محنتی ہتھیلیوں میں چیلگاریاں بھرتی۔ ان پر خونی راستے بناتی  
تکلتی جا رہی ہے۔ ماہی گیرانی خون سے رستی مٹھیاں اذیت کی شدت سے کوئی نہیں  
منبھٹی سے بند رکھتے ہیں۔ ڈور کو چھوڑتے نہیں کہ محنتی ہتھیلیاں بند مٹھیلیوں میں بدل جائیں  
 تو پھر کبھی نہیں گھلتیں۔ وہیل زیر آب جاتی ہے موت سے خالق ہو کر، میسپ پانیوں میں  
روپوش ہو جانا چاہتی ہے۔ بگرا سے سانس لینے کے لیے کبھی نکبھی سطح پر آتا ہی پڑتا ہے  
اور سطح پر ایک آخری نیزہ اُس کا منتظر ہوتا ہے اور آخری نیزہ اپنی شکتی تاک اُس کے جسم  
میں گاؤ دیتا ہے۔ وہیل کا جائزہ آخری مرتبہ سطح پر اُبھر جکا ہے اور گھرے پانیوں کو بھی خبر  
ہو جاتی ہے کہ اب وہ ہمیشہ خالی رہیں گے اور اُس کے گرد کا پانی پہلی مرتبہ ایک مخصوص  
ریگ کی سرخی میں رنگنے لگتا ہے اور اس مزدوب کو ماہی گیر سرخ پھول کہتے ہیں اور وہ  
اپنی بوڑھی کشتنی سے ٹیک لگا کر خون آلو محننتی ہتھیلیوں کو اطمینان سے پوچھتے ہیں اور  
اُس کے سرخی سے احتطرے سفید دھڑ پڑ "ہم جیت گئے" کی نظری گاڑ سے سمندر میں سفر کا

پلاسکریٹ سُلگا لیتے ہیں۔

بس فربہ، اکی کھڑکی سے باہر دایں ہاتھ پر سمند سلبے شرمی کی حذائق شانجیں پھیلاتے سا پٹ لیٹا تھا اور رات کی سیاہ شہوت اس پر جگی ہوئی تھی۔ سمند کے اطمینان کے نیچے بنے شمار و سیل چیلیاں پوشیدہ تھیں۔ سمی ہمی، مسرخ پھولوں سے خالق۔ اس کی سیاہ چادو پر اب تک تنتہ مسرخ پھول کھل پکھے ہیں کوئی نہیں جانتا۔ سوائے ان رگوں کے جنہوں نے اُخیں کھلانے کے لیے اپنی ہتھیلیاں رخنی کیں اور پھر سیاہ چادر پر مسرخ دھتے کیہے نہ لڑائیں۔ گمراہیک روز جب لوگ سمندر پر گل لار کی فصل مکمل ہو گئی تو ماہی گھیر اپنی اپنی کثیروں میں سوار ہے خطر اس میں اُتر جائیں گے۔

”مُش“ میمی روئی بیچنے والے نے میں پر سوٹی مار کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا اور اس کی باچپوں کے سکڑنے پر جھکا جھکا پاس چلا آیا۔ ”سینیر“ اُس نے سکڑ سے پر لپٹی گلابی روئی آگے کر دی۔ پاتنج پیتے اداکر کے اُس نے روئی کی زرمی کو اپنی ناک سے چھووا اور مہنہ چلانے لگا۔

”اس وقت بگلے نہیں ہوتے سمندر پر؟“  
”نہیں ہوتے“ روئی سے بھرے میں پر سوٹی سے ایک اور ضرب لگا کر دہ اپنی نشست پر جا بیٹھا۔

بس دو بجے دو پہنچناظ سے روانہ ہوئی تھی۔ ایلشے کے کھجروں کے بالوں اور مریسیہ کے چیلیں میداںوں میں اپنا بجودار دھوکاں چھوڑتی اب نکیرہ دوم کے ساحل کے ساتھ سانحہ تاریکی میں علی کافت کی سمت میں بڑھ رہی تھی۔ ڈرامیور کی نشست کے عین اُپر ایک نھا سابلب اور لیقیہ بس اندر ہیرے میں ڈول رہی تھی۔ مسافروں کے ڈھلنکے ہوئے سراور ٹوٹنے بدن سوئے نئے صرف میمی روئی بیچنے والا پٹپٹی پھٹی انگلوں سے اور اُدھروں کیجھ رہا تھا ماس کے گنجے بر کے گرو بادلوں کے گچے بلکہ رہے نئے جیسے اون کی ہرگز، میں اُبلا ہوا اندھار کھا ہوتا ہے۔ مسکراہمٹ ایک ہر دہ مینڈک کے گھلنے ہوئے منہ

کی طرح محنتی چھرو ایک ایسے بچھے سے مشابہ تھا جو دنوں میں برسوں کی جھتریاں طے کر کے پڑھا ہو جاتا ہے۔ کوئی مسافر پولو بنا یا اپل بھر کے لیے آنکھیں کھونتا تو وہ فوراً سوٹی سے ٹین کھڑکا کر رُونی کا گولا تھا میں یے جھکا جھکا اُس کے پاس پہنچ جاتا۔ سینہوں

نصب شب سے پرے دہ علی کافت کی روشنیوں میں داخل ہوتے۔ نیوں سائیں اور شرپیٹ لامپ کے زنگ بس کے تاریک پیٹ میں بھر کنٹ بجھنے لگے۔ مختلف رنگوں کے بلے آواز ٹالنے سافروں کے تھکے ہوئے چھروں پر پھٹتے رہے۔ ایک دیران اُتے کے اندر جھٹتے ہیں بس نے ایک ہپکی لی اور فاموش ہو گئی۔ مدیٹھی روئی نیچنے والے بڑھے بچے نے ٹین کو آخری مرتبہ کھڑکا یا اور اپنی مینڈک مکراہست سیست پاؤں پسار کر ایک نشت پر سو گیا۔ مسافروں کی اکشیت نے بھی بس سے اُترنے کا تردود نہ کیا بلکہ پھر بدل کر پہلے کی نسبت نیادہ پر سکون ہو کر آنکھیں بند کر دیں۔ وہ اُندس کے اُن امہراتے ہرنئے قبصوں سے آئے تھے جہاں تما مرتقابل کاشت ادا صنی کسی ڈیگ پاؤچس کی ذاتی ملکیت ہوتی ہے۔ ہمان شخصی ریاستوں میں گناہ بھی وہی کرتے ہیں اور اُن کا ثواب بھی لیتے ہیں۔ ترقان صرف ڈین پر شفقت کرنے کا گناہ کرتے ہیں اور خاہر ہے لیے گناہ کا ثواب نہیں ہوتا۔ چنانچہ موسم گرمیاں وہ ایک ملٹی ول کی صورت اس شہر مندر پر بیغاڑ کر دیتے ہیں اور غیر ملکی سیاحوں کے اُبٹ پاش کر کے، اُنھیں حفاروں پر آندسی لوگ گیت سنائیں اعلیٰ اور پیارہ کا بند ولبست کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ آج کی شب اسی بس میں گزار کر وہ اگلی صبح علی کافت کے شفات شرمنی مکھیوں کی طرح بھینہنے لگیں گے۔

اُس نے اپنے سفری تھیسے کو ایک مردہ کتے کی طرح بس کے دروازے تک گھیٹا اور پھر جیسے ایک نقلی عنزو کو جسم پر باندھتے ہیں اُسے کندھوں پر سڑپے جکڑ کر اُتے سے باہر آگیا۔

علی کافت کا الیڈ سے ریسارت رات کے اس پر بھی زندہ تھا۔ ساحلی مڑک کے دلوں طرف پام کے درختیں کا ایک سلسہ تھا جن کے درمیان میں کسی نو دلیتی کی کوٹی کے دنگ برجئے چیز کے فرشوں کی مائدہ لرثیتے سے بنے ہوتے تھے۔ ان پر روشنیوں

کا چکا چوند عکس تھا مورش حصار کے دامن میں لوگ ابھی تک سفید ہو گئے اور بھر کیلے گاؤں میں مبوس شراب پی رہے تھے۔ ریتلاؤں سے باہر سفید آہنی جنگلوں پر مکیوں کی طرح وحشت اذالی اور قشت نازی دہقان تھے جو کچھے ہوئے پیٹ اور غربتی رنگ کے چرسے شارب شدہ پلاٹچی نظریں پھانے ان کے بناں اور سامنے رکھے مشروب کے باسے میں بھینختے ہوئے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ سفید آہنی چار دیواری جسے پھاند کر وہ اندر نہیں جاسکتے تھے۔ اور اس چار دیواری میں بیٹھے ہے کفر سے جن کے دم و ڈھان میں منخار کا اس کے پاٹچکے ہوئے پیٹ ہیں۔ غربتی رنگ ہیں نہ علی کافت کے پڑیجیں بالکل نیروں اور سفید پیٹ کے ہوئے فائیروں شارب ہو ٹل ساحلی مٹرک کے ساتھ ساتھ دسیل مچھلیوں کی طرح ابھرے ہوئے ان کے بدن میں سے امارت کے بلند فوائے سانش کی مانند اہل رہے تھے پرہمی نہ کے مرے پر دوسرا درجے کے ہوٹلوں کا سسلہ تھا اور آخر میں جہاں ساحلی مٹرک کی آخری تیز روشنی تھی وہاں تیزیرے درجے کے مسافر خانے اپنی حیثیت کے مطابق کندھے جھکاتے ہوئے تھے اور ان ہوٹلوں کے پڑیجے اور دائبیں اور بائیں ہاندہ پر علی کافت کا پرانا تصور تھا سرخ چھتوں میں گھری ہوئی تھیں۔ صرف ایک جانب فرار کا راستہ تھا، سمندر کی جانب..... مگر سمند میں تو گل لالہ کی فصل مکلن ہونے کو تھی۔

ٹپلوں کو سفر کی رُکی رُکی حرکت ابھی تک کچو کے دے رہی تھی اور لفظیہ جسم کو تحکم کی ایک بڑی مٹھی برابر حصیچے جا رہی تھی۔ وہ قدموں کو گھستیا چتا رہا کہ کیپنگ سائٹ شہر سے تین کلومیٹر باہر واقع تھی۔ جیسے ہڑپ اور سوہنگو ڈارو میں دستور تھا کہ غلاموں کی لبستی ہمیشہ شہر سے رُور نہیں کی جاتی تھی۔ اسی طور اُج کے سیاحتی شہروں میں بھی کم حیثیت لوگوں کے لیے کیپنگ کی جگہ شہر سے پرے ایک محنت ناصلے پر بنائی جاتی ہے۔

علی کافت کا سرخ کھریل سے ڈھکا آخری گھر اُس کے عقب میں چلا گیا۔ اب ہاں کہی پہاڑوں کا سسلہ تھا جن پر اکاؤ کا ولاز کے مورش باخزوں میں بھروسیاں ناٹشی پکوں کی طرح چمپ چمپ کر دکھ رہی تھیں۔ دائبیں ہاندہ پر سمندر ابھی تک ساتھ دے رہا تھا۔ ہر کہنا

گوپی چندہ بول میری محصلی کتنا پانی؟ بول میری وہیں مچل تھکے ہوئے پاؤں سڑک پر پڑتے تو نہیں لگتا ہے کوئی یونچے سے سڑک کا غیرہ آن کے یونچے سے کسکا ناجلا جا رہا ہے اور وہ کہیں نہیں جا رہا ہے، ایک ہی گلہ جمکت میں ہیں۔ قین کو مردِ انتہائی طریل تو نہیں ہوتے مگر ہو گتے، اور جب بالآخر ختم ہوتے تو وہ ایک بند چالاک کے سامنے کھڑا تھا جس پر انہیں میں دکھنے والی گلبی روشنائی سے علی کامن کیمپگ "خیر خاگھر دیر سے کوئی نہیں دلکھ کی طرح اس نے پہلے تو ہوئے ہر لے مستحیل کوئی نہیں پر بجا یا اور جب اس کا خاطر خواہ یقین برآمد ہے ہر اتر بے خوف ہو کر حضرت صراحت سے کوئی نہیں لگا۔ ایک طریل وقفے کے بعد کوئی شوانی اواز نہیں سے بڑھاتی قریب آتی گئی اور چالاک کا ایک پٹ آہستہ سے واہرنے لگا جو پڑتے ہے سرا اور دیکھ تون تو شش کی ایک حورت اُنھیں ہوتی ہوئی اُس کے سامنے آگئی۔

"بارہ بجے کے بعد کیمپگ میں داخلِ ممنوع ہے یہیں اب تم آگئے ہو تو آجائو"

"بس دم لیتا چاہتا ہوں اور پھر اپنی راہ لوں گا"

یہیں وہ منہ نہیں رہی تھی۔ بس تیزی سے چلتی جا رہی تھی۔ نسل انسانی کے ماں دخلت تداڑ کے خیسے، سینید کاروں اور ٹورسٹ و لگنیں ۔۔۔ چاروں طرف اک شرخِ خابیدہ تھا۔ ایک مقام پہنچا تاریکی مزید گھری ہوتی تو چوچ کیا رعورت ڈگ گئی۔ فی الحال خیر میں نسب کرو، صحیح ہرگی تو اپنی من مرضی سے جہاں جی چالے ہے شفعت کر لینا۔"

"اور پاسپورٹ..... اُس کی آذانے تاریکی میں ٹھم ہوتی چوچ کیا رکا پھاپیا۔

"صحیح..... انہیں کے گھر گلٹ میں سے آخری جواب آیا۔

ایک ناتجرا کارکے لیے اتنے گاڑھے انہیں میں خیر نصب کرنا ایک بے سور کوشش ہوتی۔ گرام کے ہاتھوں کو معلوم تھا کہ خیسے کے کن سوراخوں میں اگر ہو سے کاٹ دیا پڑ دیا جائے تو وہ ایک پھوٹے ہوتے بلا ذکر کی طرح تون جاتا ہے۔ کون سی میخ کہاں گاڑی جانی ہے، ایک بوڑھے جلا دکی طرح جو گئی رات کسی مجرم کے پاؤں، ہتھیلیوں اور گردن میں میخیں ٹھونک کر اسے مصلب کرتا ہے اُس نے خیسے کو نصب کرنا شروع کر دیا۔ کوئی بھی عن جب ٹرائل اینڈ ایر کے مرحلے سے گزر کر محسوس تجربے کی صورت اختیار کر جاتا ہے تو پھر گاڑھے

اندھیرے میں بھی اسے کمال خوش اسلوبی سے سرخاجم دیا جا سکتا ہے جیسے کے عارضی گھرنے شکل  
اختیار کی تو اُس نے پرداہ امدادیاں میرا گھر کی  
ستھان اگھر کماں ہے؟  
”فی الحال یہی ہے۔“

”نہیں فی الحال کی شرط ناوجہب ہے، گھر کماں ہے؟“

تم شاہ زمان انتحار اگھر کماں ہے؟ بریڈ فورڈ کا شہر جو صرف جنگ افغانی لحاظ سے دلات ت  
میں واقع ہے یا شاہد سے کی کچی آبادی جب دن چھوڑا تھا تو تم ایک حصہ معمول پڑھے لکھے اور  
قدرت سے ہیر قوف سے فوجان نختے، جوز ریز میں چلنے والی ریل گاڑی میں سوار لگیوں کے  
بھرے بھرے بھرے بلا ڈوز روں میں گم ہوتی ہوئی لگیوں کو دیکھ کر ہی چھرو منخر کر لیتا تھا،  
اور جواب تاریخ میں بھی اپنی میخ نشانے پر گاڑ سکتا تھا چاہے زمین سخت ہو یا کچھ داکود۔  
لیکن ناکم ٹوپیاں مارنے اور ٹھووس میخی تجربے کے درمیان دس برس کا عرصہ تھا تمہر  
اس لیے ولایت گئے تھے کہ دہل مزدوری کر کے اپنے کچھ کوٹھے کو ایڈیوں کے چیزے  
میں بدل دو اور بُرڈھی ماں کو سہارا دینے کے لیے ایک رکشا خرید لو۔ ان میں سے کوئی  
کام بھی نہ ہوا اور دس برس دیت گئے۔ ماں نے آخری خط میں لکھا تھا: ”میا اب تو  
والپس آ جاؤ۔ یون کریانے والا اپنے اُدھار کا تقاضہ بھی نہیں کرتا بلکہ اپنی بیٹی کے لیے  
رشتے کا خواہشند ہے۔ اب تھیں نہانے کے لیے میت میں بھی نہیں جانا پڑے گا۔  
ہم نے گھر میں بھی کافی کھانا کو لایا ہے۔“ ایک اس نکھلے میں سے تو پانی نکلتا تھا، بیٹی نہیں۔ اور  
تم تو ہر شام بڑینیا بار کی سڑاگنگ بیٹر کے چھ گم انڈیلے کے بعد کسی گوری طوالت کو بازو میں  
ڈال کر اپنے کمرے میں جانے کے عادی ہو چکے ہو۔ تھارے لیے یہ عمل عیاشی نہیں معمول  
بن چکا ہے۔ تم معمول کے مجبور ہو، والپس کہاں جاؤ گے؟ فیکر میں سالاہ چھپیوں کے موقع  
پر اگر تم ہسپانیہ میں آنکھے ہو تو مقصود تاریخی مقامات میں نہیں بدن مقامات میں گم ہوئے ہے  
اوھر سو نیکا طقی ہے۔ سو ٹیڈش لڑکی جو ساحلی علاقوں میں صرف سن اینڈ سینڈ کی تلاش میں

نہیں آتی بلکہ ایک تیسرا اُن نظریہ مزروعت کے تحت اس کے بدن پر حادی ہوتا ہے اور وہ ہے سیکھ قم تو اندھیرے میں بھی خیمہ کاٹ لیتے ہو۔

بُو..... بُو ہے یا میری تھکاؤں کا پسند..... نہیں بُو تھی اور پھر ورنے کی آوازیں ..... کیا بھی ہے کوئی رورا ہے، بین کر رہا ہے۔ نہیں بیان میاں ایک رہی تھیں عزار ہی تھیں اس بُو اور عذر آہستے میں ایک اور جیوانی آواز شامل تھی جو دبے دبے ان سے باتیں کر رہی تھی۔ روٹی۔ بین کرتی بیان ..... میرے بدن پر ان کے کھڑے ہوئے بالل کی جگار ایک بیخیا کی صورت چل رہی ہے اور میرے ہر مر جس سے، اُدمُردم، اُن لوگ سے وہشت پھوٹ رہی ہے، بیتوں کا ایک اُکٹھا ہے جو گھانڈر پفائرس کے لیے ریسل کر رہا ہے۔ اور ان کے درمیان وہی جیوانی آواز ہو تو غون سے اُبیتی ہے اور اس کالا دالمجھر کے لیے ان کچکپا تی عزار ہٹلوں کو ٹھنڈا کر دیتا ہے ..... بُو مچھلی کی تھی مگر اس میں مٹراند تھی۔ جیسے جنگلی ستارے کے گوشت کو فرائنگ پین میں ڈالا جاتے تو یہ دم بجھکا اٹھتا ہے میری تاک اس بُو سے نا اشنا ہے گر ہے یہ مچھلی کی۔ اتنی تیز کشا پہ میں سڑی ہوئی مچھلیوں کے ڈھیر پر سویا ہوا ہوں۔

دومرتہ زمان نے اپنے خیمے کی زپ کو ٹھوٹلا اپنے اطمینان کے لیے، بگرد کسی ٹھوٹ جسم پر کسی ہوتی زپ کی طرح مبنی طبقی۔ صحیح کی خلکی جب خیمے کے کپڑے میں سستہ کر کے اس تکٹ پھنی تو یہ دم غیند دبے پاؤں بدن کے بستر پر دراز ہو گئی۔

”اوہ میگی، اتنی دیر سہ تلاش کر رہی ہوں ڈیم یو۔ کہاں دفع ہو گئی تھیں؟“  
”کسی اور خیمے میں نہ تھی لیکن اسمندر میں تھی؟“

”اسمندر میں ہتھاری بھینی تو میرے بیک میں پڑی ہے بالکل شوکھی .....“  
”اوہ لیز اڈ تیر، اتنے خشکار پانی میں صحیح سوریے کچھ پین کرنا یا جانا ہے ٹوپڈ؟“  
سلوپ نے بھی جواب میں کچھ کہا اور جو زمان تک نہ پہنچ سکا۔

ہمیں لڑو..... بچوں کے لیے ناشستہ تیار کر دو، درودہ اپنی زنگین بالٹیاں اور گینڈاٹھاکر ساحل کی طرف جاگ جائیں گے ۔

”سال بھر میں وہ نہتے کی چیزیں اور ان میں بھی مجھے ایک غلام کی طرح کام کرنا پڑتا ہے۔ میں کہتی تھی ناں اس مرتبہ کسی ہٹولی میں ٹھہریں کہنگ کی جاتے میں اگر کسی کافی نہ ہوں کیسے میں چلی جاتی تو شاید زیادہ آرام نصیب ہوتا..... ہونہ نا شست.....“

”اس سڑکی دلیلی کی طرف دیکھو جو اپنے کاروان کے سامنے سلاخن پر گوشت بیوں ہے ہیں..... کیا خیال ہے ماریا؟ اگر ہم قریب جا کر کھڑے ہو جائیں تو شاید آفر کر دیں۔“  
”مجھے مجھوں نہیں ہے..... حشیش تملتی نہیں ہیاں..... ڈار لگکہ سراکو چلیں۔“

”فرٹر فرٹر..... آج کہاں چلیں؟“

”آرام سے بیٹھے رہو..... میں بتاؤں گا جب گردبنا۔“

”بہت بہتر فرٹر..... میں تو دیسے ہی پوچھ رہا تھا۔ رات نیند کیسی آئی؟“

”بکواس بند کرو شوان..... تم نے سونے دیا؟“

زان دیر کہ سوتا رہا تھا۔ اُس کے اوپر خیے کا ہلکا سبر کڑا اپانی کی کڑی دھوپ ک شعاعیں جذب کر رہا تھا اور نیم روشن تھا۔ میں یہ پشیدگا باہر کا حصہ۔ باہر کہنگ کا شہر بیدار سرچکا تھا اور دیر پ کی مختلف زبانیں گھلتی ملتی فضنا میں چیل دی تھیں۔ اُس تکت ہنخ رہی تھیں خیے میں کھڑے ہوئے کو تو جگر دھنی چنانچہ زمان نے کسی جاپانی ہٹلوان کی طرح یہ شیخھنگیں چلا کر کپڑے بدلے اور پدها اٹھا کر باہر آگیا۔

اُس کا چہرہ اور نصف آتین میں سے نکلتے ہوئے بازو ایک بڑے سانپ کی سکڑتی ادا سوٹوں سے بھر پور کہنگی کی طرح کھڑے اور لیے جان تھے۔ جلد پر مردہ مچھلی کے چانوں ایسے کھرینڈا بھرے ہوئے تھے۔ ایک سوت سادھو کی طرح سر جھکائے دہ گرد میں پڑے اخبار کو لٹکلی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے پھٹے ہوئے نیلیت بوٹوں کے گرد بیٹوں کا ایک عزل تھا۔ کچھ صیغ کی دھوپ میں مزے لینے کے لیے اکٹھی ہٹوئیں اور بار بار موچھوں

وہ اس کھول کر جما ہیاں لیتی ہوئی اور بیشتر بے حد کارہل کے ساتھ اُس کی گرسی کے گرد گھومتی ہوئی۔ وہ ایک غیر مرنی دائرے میں پل رہی تھیں جس کا مرکز وہ شخص تھا۔ بے جان کیفیتی کے جسم والا بڑھا۔ اُس کے عقاب میں ایک بہت بڑا خیر تھا۔ بیسے میدان بنتگیں یا پل نامش کے ہر اک تے نئے گرفقیر کی گدڑی کی طرح رنگ برنسج پوسیدہ پیوندوں سے چپکا ہوا۔ پیوندوں کی وضع قطع سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک زبانے میں بڑھ کے مبنی کو  
بھی لٹھا نہیتے تھے۔ لگنا تھا کہ پیدائش سے لے کر اب تک کی اُترن سے اُس نے اپنا یہ گھر بنایا ہے۔ شیئے کے رد فوں طرف میں کے بنے ہوئے متعدد بڑے بڑے ڈبے تھے جن پر کھصیں کا ایک مٹڑی اول منڈلا رہا تھا۔ وہ قطاروں کی صورت میں ڈبوں میں داخل ہو رہی تھیں جن کے سچے صور کے ساتھ مٹاٹ کے قیبلے مضبوطی سے بندے ہوئے تھے۔ پکھ پکھاً اپنے دالی پچی کے سچے بندھی پوریوں کی طرح۔ یہ قیصلے آہستہ حرکت بھی کھتنے تھے کہ تھیں کی منزل یہی تھی اور پھر وہ مخصوص پوچھی کہیں اُس پاس تھی شری ہرمنی چھلی کی پور، کبھی کجاہ کوئی تی اُسلٹے پاؤں چلتی اپنی پُشت بڑھ کے نیست برش جمادیتی توہہ بڑی وحشت سے اُسے فٹ بال کی طرح ہوا میں اچھا دیتا۔ تی زمین پر گرتے ہی اُسی سُستی کے ساتھ وھوپ سینکھنے لگتی۔

زمان کو دیکھ کر بڑھنے نے سر اٹھایا۔ اُس کی آنکھوں پر بھی شاید بھرپاں تھیں اور ان کے گرد کوئے کے پنجوں ایسے سیاہ حلقوں چھٹے ہوئے تھے زمان کے ہونٹ پکھ کرنے کے لیے پھیلے تو بڑھنے نے سرھکایا اور اخبار کو سلکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ ایک بتی اُس کے فلیٹ برش پر بیٹھ گئی گمراہ سے اس نے ہوا میں اچھا لاء، بیٹھا رہنے دیا۔  
زمان کے چاروں اور لا تعداد خیے پھیلے ہوئے تھے، جبڑاں بچوں کی طرح ایک درمرے سے پیروت صرف بڑھنے کا خیر ان سب سے الگ ایک ایسے ٹیلے پر الیتادہ تھا جہاں سے سمندرا کا پوراوجود اُٹرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس ٹیلے پر اور کوئی خیر نہ تھا اس لئے زمان کے جو ایک سے ہوئے کبر تر کی طرح اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ وہ ساحل کی جانب اُترا تو مختلف خیوں کے باہر بیٹھنے ہوئے وگ اُسے دیکھ کر حسب متعدد رہنمہ لاتے، بیجوں

سکھتے یا پھر ایک نگاہ ڈال کر اپنے اپنے کاموں میں صرف ہو جاتے۔ اور کام کیا تھے کافی کی تباہی، پھر تے ہوئے ہناف کے بابس سکھانا یا وحرب سنکنا، بیان میگی اور اس کی سیل کا خیر بھی تھا جو اسے علی المصبع سمندر میں صرف پیدائشی بابس میں ہناف پر سرزنش کر جیکی تھی۔ وہ جرم خاذلان بھی تھا جس کی خالون خادن پاچھ بچوں کا ناشہ بناتے بناتے مذھال ہو رہی تھی یہ پی جوڑا بھی تک امریکی نیل کے قریب اس امید پر کھڑا تھا کہ اپنی دہل سے کچھ کھاتے کوڑل جائے گا اور وہ جرم نوجوان بھی جن میں سے ایک اپنے دوست کے سامنے آتا واب کر، اتنا موڈب ہر کربات کرتا تھا جیسے وہ ابھی اسے غلطت سے نواز نہ کو ہے۔ ساحل پر حسب موقع پچھتے ریت کے قلعے تیر کرتے ہوتے اور لڑکیاں تھیں اندھی لیٹی ہر قبیلیں کے بالائی سنتے کی گھوڑے ہوئے اور پچھلے سنتے کو پھرنسی لکیر کے آغاز تک کھسکاتے ہوئے۔ اور جوڑے سنتے بڑا یا کے اس رشتے میں بندھے ہوئے جسے شادی کہتے ہیں ایک ذکار بودھ سنتے اور علی کافت کا شر تھا پچھلی شب کا بھڑکنا ہو اور وہن علی کانت جو ساحل کے سامنہ ایک مردہ دہل پچھلی کی طرح پڑا ہوا تھا۔

اور سمندر تھا..... ایک نیلا ریختان جبے آب دگیا اور خاموش تھا۔ بظاہر....  
گراں کے اندر.... سطح سے نیچے..... اس کے بڑے پیٹ میں دہل مچھلیاں چاہی دار کھلڑوں کی طرح تیردی ہتھیں۔ شاید انھوں نے سطح آب پر اگر سانس لینا چھڑ دیا تھا کہ وہ خالف تھیں اس بھڑٹی سی کشتی سے جس میں کھردی انگلیوں والے ہاتھ تیرے تھا میں اُن کے منتظر تھے۔ اُن کا خوف بے وجہ تھا۔ اس وقت سمندر پر کہیں بھی وہ کشتی نہ تھی..... بگروانے کب نہ دار ہو جائے۔

اور سمندر تھا..... اور سمندر کے اوپر آسان میں ایک جہازی سائز کی پینگ معلق تھی جیسے دہل چک گئی ہو۔ البتہ اس کی طبلی جمالدار و مکسی جاپانی مفرغ کی دم کی طرح فضای میں لہریتے سے لے رہی تھی۔ اُسے کون اڑا رہا تھا؟ اس کی مددی سے اندازہ ہوتا تھا کہ ڈور زمین پر کھڑے کسی انسان کے ہاتھ میں تو نہ تھی۔ ساحل کے عین اوپر

لکھنی فلیٹوں کی بلند عمارت پر شاید..... کاش اس کی ڈور رُوت جاتے، یہ بہر جاتے اور میں اسے رُوت لڑنے سلپر خض محل اگر ایسا بھی ہر جاتے تو یہ خوبصورت پنگ سمند میں گرے گی اور سمندر پر خطر نہیں۔ اس میں وہیں چھپلیاں تھیں۔ اُسے گُشتے کے لیے بھے ایک چھٹی سی کشتی درکار ہو گی..... اور ابھی شاید اس کا وقت نہ تھا۔

میرا مدن خون میں خون کی گروش اور خمار کی آسُوگی کے ترازو بہرہ میش سے جھوٹا رہا تھا۔ یہ باقاعدہ، یہ انگلیاں ایک کھبار کی طرح ہر قسم کی مٹی کو ڈھالتے، اُس میں مدت پیدا کر کے اُسے گیل کرنے کے عمل بھائشا نہ تھے، ماہر تھے۔ لنت کے تمام عمل روٹیں کے پہنچ پر بندھے ایک معمول ہو چکے تھے۔ گرا ایک ایسی لنت بھی تھی کہ جس کے لیے خواہش ابھی باقی تھی۔ ..... بہت سے برس گزے۔ بنت کی شام کے دھنڈ کے میں میں آنھیں پھاڑ پھلاڑ کر نیم تار ایک آسمان پر اُن پنگوں کے ساتے ڈھنڈ رہا تھا جو شہر سے باہر کے باعزوں پر کوٹ کر اب ہی لوں کی طرح میرے اور پر سے گزر رہی تھیں اور اُن کی ڈوریں میری پیغام سے باہر کیے گئے تھے۔ میں اپنے کچے کھٹکی میں لکھتی تھکتی پلی جا رہی تھیں۔ میں اپنے کچے کھٹکے سے نیچے اُترنے کو تھا کہ ایک دم میرے کان پر جیسے ایک نامعلوم آری سی چل کر ٹھٹھے سے ہو، جیسے ٹھٹھے کی لمحتی جھنسیاں رہی ہو، میں نے دھشت میں کان پر ہاتھ مارا تو وہ آری میری شفیقی تھی انگلیوں کے درمیان چلتے گئی۔ میں نے فوراً متھی پیغام لی۔ چند لمحوں کے لیے ڈور ایک مژده کیپنپرے کی طرح بے حرکت پڑ رہی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے جیسے کسی لال میں پڑی رہی کی نالی میں پانی بھرتا ہے وہ تمنی تکنی۔ پنگ دھانے لکنی ڈور تھی کہاں تھی اور آسمان تار کیہ تھا۔ میری کھڑوڑ میٹھیاں تھی ہر ٹھنڈی ڈور کو اپنی نام ترقوت سے تھا سے ہوتے تھیں مگر وہ آہستہ آہستہ کسک کسک رہی تھی اور اس پر اُبھرا ہوا تیز بانجھا میری سہیلی پر ایک خون آلو دراستہ بنا رہا تھا۔ زخمر کی اذیت کے باوجود میں اُس کی تیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اور پھر آسمان کے اُس حصے میں جہاں میری نادیدہ مجبور ہے پکوڑے لے رہی تھی ہوا کا زور بڑھا اور ڈور میری ناؤں میٹھی میں سے اس تیزی سے نکلی کوچے کوٹھے کی کچی مٹی پر گرمیوں کی دصربیں کے باوجود کش روڈز تک ٹھبٹے نشان دکھانی

میتھے ہے..... میری انھوں میں آنسو تھے اور مٹھی خون کا دمکر بند۔ وہیں جب تاریک سندھ  
میں ڈینگی مار جاتی ہے تو ماہی چیزوں کی نظروں سے ادھل ہو جاتی ہے اس پر کچھے  
ہوتے نہیں سے بندھی ڈوراں کی ہتھیلوں کو نہ لہماں کرتی پھسلتی جاتی ہے، وہ اُسے  
چھوڑتے نہیں، مگر میں نہ اسے چھوڑ دیا اور وہ وہیں میرے قبضہ نہ رست سے نکل کر آسمان  
کے تاریک سندھ میں کھو گئی۔ آج ..... اب میرے ہاتھ پلے کی نسبت معمبوط تھے اور  
ہتھیلیں تو آنا۔ وہ ڈوراگر میرے ہاتھ میں آجائے تو میں اُسے کہیں نہ چھوڑ دیں کہ دہیں تھیں ہوتے  
سے ہمکنار ہوتی ہے اس کے گرد ترخ پچال تجھی کھلتا ہے اگر ڈور کو مصنفوٹی سے تھامے رکھا  
جاتے ..... خون میں خون اور راکھوں کی گردش کے قریب میں اکتنے ہر سچے جنم کے لیے  
لذت کا آسمانی احساس آج بھی اُسی تھی ہرئی ڈور سے عبارت ہے جو بنت کی شام  
میرے کاؤں پر سرسرائی تھی ..... اور پھر زپھن میں ایک مخصوص خواہش ہمیشہ میرے جنم  
پر ریگتی رہی ..... اگر میں ایک شہزادہ ہوتا تو اپنے تمام درباریوں، وزیروں، معاشروں  
کو بتا کر وہ بھی کے پار اس ادنیٰ پچھے کوٹھے پر کھڑے ہو کر یہ بڑی بڑی پنگیں اُتھیں  
اور جب وہ آسمانوں سے ناک رکھنے لگیں تو انھیں انھوں سے چھوڑ دیں، ڈور کو خود توڑ  
دیں ..... اور میں ادھر ..... اس کچھے کوٹھے پر کھڑا ان تمام پنگوں کو گوشار ہوں۔  
صرف اُس تجربے سے تعلف اندوز ہونے کے لیے جب ڈور تھامے اور پرآہنگی سے  
گرتی ہے اور تم اُسے جھپٹ کر تھام لینے ہو اور پھر وہ دھیرے دھیرے تمنے لگتی  
ہے ..... میں شہزادہ نہ بن سکا مگر دھرمے کوٹھے پر تمام دزیر، امیر سینہ بڑی بڑی  
پنگیں اڑا رہے ہیں۔ میں اپنے کچھے کوٹھے پر چھپتھڑوں میں لپٹا نشگے پاؤں پچکے ہوئے  
پیٹ کر تھامے اُن پنگوں کے کٹھنے کا منتظر ہوں مگر وہ اُنھیں کبھی نہیں چھوڑتے میرے  
لیے، ان کی ڈور مخبر طبیعی اسے اور وہ کبھی اسے میرے لیے نہیں توڑیں گے جب تک کہ  
میں ایک بھروسی کشتی پر سارا ان پنگوں کے درمیان نہ چلا جاؤں اور انھیں اپنے بازوں  
سے توڑ کر ٹوٹ نہ ہوں .....

”گشن مارگن“

زمان نے چونکہ کریچے بنا گاہ ڈالی۔ جرمون روکے ریت پر قدم جلتے آ رہے تھے۔ اُن میں سے ایک دہ مخصوص جرمون تھا جو قدسے فڑ پہنچتا ہے۔ تحریر خراطی ہر ٹھیک گال  
ہر وقت سرخ رہتے ہیں اور بیشرا لوں میں مخمور ہو کوئی میز پر چڑھ کر بچتے ہوئے  
دٹھیں لینی پڑے اور ایسیں ہاتا ہے۔ دوسرا لڑکا اگر تن کر کھڑا ہو تو مشاتی سکتے ہوئے  
سوٹ میں اُس کا یانکا جسم ایسے ہیپاڑی کا تھا جس کی رگوں میں شاہی خون کی فرنمازوں  
آمیزش ہوتی ہے۔ مگر جب وہ دو قدم چلتا ہے تو اُس کے لمحتے ہوئے کو ہوں اور  
بازوں کے نسوانی سحر کو دیکھ کر طبیعت متلانے لگتی ہے۔ زمان کو بسح بخیل کا رُزد  
بیشراں والے جرمون نے کی تھی جو ایک بے دام فلام کی طرح دھرے کے بیچے بیچے چلا  
اکرنا تھا۔

ہپاڑی سمندر تھنوں میں ایک بھیب سنساتی باس پھیلا دیتا ہے..... ہا۔ ہا۔ ہا۔  
جرمون نتھنے پیسا کر رہا۔ ہا۔ ہا۔ کرتا اگر سانس لینے لگا۔  
اُس کے بانٹے ساقی نے کندھے اچکاتے اور باریک ہنٹوں کو بھینچ کر اس  
عمل پر ناپسندیدگی کا انٹھا رکیا۔

”ہا۔ ہا۔ ہا۔ سمندر۔ تانہ ہوا۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔“  
”اوکر کیا گنتھ؟“ یانکا جرمون اپنے ہنٹوں میں سے جیسے تھوکتا ہوا بولا۔  
”اد قم فرٹ۔۔۔ اور قم“ موٹے جرمون نے اتنے پالت پایا سے کہا کہ اگر زمان ہاں  
نہ ہوتا تو شاید وہ اُس کے قدموں میں رُختے لگتا۔  
”آپ پھلی شب بست دیر سے کیپنگ میں آئے“ فرٹ زیک دم زمان سے مخالف  
ہو کر بولا۔

”جی“

”تبھی“ فرٹ کے بچنے ہوئے ہنٹ سفا کا نامہ میں پھیل گئے۔  
”تبھی کیا؟“  
”تبھی آپ باشاہ کے ہسائے میں ہیں۔۔۔ بہ حال اندر ہیسے میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔“

”ہاں اندھیرے میں..... گفتگو خوش ہو کر چکا۔

”بگاس نہیں کرو شائن ۴ فڑکی آواز ایکستی سیٹی کی طرح چھپی۔ سطھ اور عامت کو گرفتار ہوئی۔

”سوردی فڑکی..... گفتگو نے ایک پیشمان کتنے کی طرح سر جھکایا اور پھر فرائی ہاہا کرتا نہتھے پھلا کر سمندر کی ہواؤ کو لپٹنے اندر کھینچنے لگا۔

”لیکن میرے خیمے کے سامنے ایک بوڑھا ہے..... لاتعلادبلیوں والا بوڑھا۔“ فڑکی نے ایک تحریر سے تھڑی ہوتی مسکان کے ساتھ زمان کو حصارت سے بچا۔ قم جب رائلٹی کو دیکھتے ہو تو تمہیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ تم رائلٹی کو دیکھ رہے ہو۔ وہ ایک غلیظ سے قمچے کو چلاتے ہوتے بولا۔“ وہ رائلٹی سے براوں میں وہ بلیوں والا بوڑھا نہیں بادشاہ سے قم نے اس کے خیمے پر لہراتے ہوتے جنڈے کو خود جا کر پوچھ لے۔“ یقین نہیں کرتے تو خود جا کر پوچھ لو۔“

”اور صرف بلیاں نہیں.....“ فڑکی خوش کرنے کی غرض سے گفتگو میکین صورت بناتر کر پوچھے منزہ کہنے لگا۔“ بلیاں، بھیاں، پھیلیاں..... رات کو ان کے عزانے کی آواز نہیں آئی؟ مچھلیوں کی مڑاند سے آشنا نہیں ہوئے؟ مچھلیوں کی بھینہنا ہٹھ تھا سے کافی میں نہیں سرکتی رہی؟..... یہ آوازیں اور پو بادشاہ کی سلطنت کا قومی تراث ہے..... گاؤں سیلو دی لٹک..... ل..... ل.....“ اُسے پھر مند کا خیال آگیا اور نہتھے پھلا کر گھر سے سالن لینے لگا۔ ہوا خوری سے پیٹ بھر کر وہ زمان سے ایسے سوال پوچھنے لگا جو کمپنیگ میں آنے والے ہر فوادر سے پوچھے جاتے ہیں کہاں سے آئے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ کتنے روز قیام کرو گے؟ اور پھر تینوں کمپنیگ کی جانب چلنے لگے۔ فڑکی نے ملبے ڈگ بھردہ تھا اور گفتگو اُس کے پہلو میں اچک اچک کر رہا ہوئے کی کو شش کر رہا تھا اور ہانپتے ہوئے زمان سے گفتگو بھی کرتا چلا جا رہا تھا۔ اپنے خیمے کے قریب پہنچ کر انہوں نے اسی داہیں۔

کہا اور چکے سے اندر چھس گئے۔

اپنے پریند خود وہ خیمے کے سامنے بیوں والا بوڑھا، بیوں میں گھر حسب سابق اخبار پڑھ رہا تھا۔ فرٹز نے درست کہا تھا۔ خیمے کے بالنس پر ایک جھنڈا نما چلی پڑا پھر پھر اڑا تھا اور اُس پر لگ آف سکات لینڈ ”کے انداز لکھے تھے۔

”بادشاہ کی سہائیگی میرے بس کی بات نہیں“ زمان نے خیمے میں داخل ہوتے ہوئے سوچا۔ میں تو علی کافت میں اچھا وقت گزارنے کی خاطر آیا ہوں۔ اور اگر آپ ایک عدد اچھا وقت“ اپنے خیمے میں لا رہے ہیں اور وہاں یہ بوڑھا اور اُس کی بیان چوکیداروں کی طرح برا جہاں ہوں تو ایسے حیوانی ماحول سے دہشت زدہ ہو کر ”اچھا وقت“ تو پاس بھی نہیں پہنچنے دے گا۔ ساحل کے قریب خیر لکایا جائے۔“

زمان نے اپنا خحصر سامان سمیٹا اور خیمے کو اٹھاٹنے کی نیت سے باہر لے گیا۔ پہلے میخوں کی باری ہتھی جو پچھلی شب عجلت کے سبب زمین میں پوری گھرائی تک نہیں اتری تھیں۔ وہ اُن کی گرد نیں پکڑ کر خود روکھبوں کی طرح مزے سے اٹھاٹنے لگا۔

”ہیلو! لیڈی می.....“

زمان کی چٹکی ابھی پانچویں میخ کے گرد بھیج رہی تھی کہ بوڑھے کی آوازاً۔

”ہیلو!“ چٹکی میخ پر جبکی رہی گراس نے بوڑھے کی جانب دیکھا نہیں۔

”میں نے کہا ہیلو! لیڈی می“ وہ پھر لے لा۔

زمان نے اُس کی طرف ایک سپاٹ چھر سے دیکھا۔ بوڑھے کے سفید و انت اُس کے پڑپری جھے ہرنٹوں سے باہر اکر چکنے لگے۔ چھر اُس نے ایک مہرست بھینچا اور فرما رہی کھول دیتے۔ مگر اس مرتبہ اور پروالی قطار میں سے اُس کے تین دانت غائب ہو چکے تھے۔

”کہاں سے آئے ہو؟“

”پاکستان کا ہوں؟“  
”وہاں مکھیاں ہوتی ہیں؟“  
”ہاں بست ہوتی ہیں“

”تو پھر مجھے ان کے بارے میں تباہ..... آؤ۔“

زمان آخری میں کہتی تھی پر کہ کراں سے کچھ دیر تک لگھتا رہا اور پھر بوڑھے کے پاس چلا گیا۔ ایک پی نے فرائس کے پاؤں کو مٹھا اور پھر دم اٹھا کر دھوپ میں انگریزی لینے لگی۔ بوڑھے نے ایک مرتبہ پھر ہونٹ بھینچنے کا عمل دھرا یا اور اس کے گم شدہ نقلي دامت تنسی میں واپس آچکھے تھے۔

”اُن جمن سو روں کے خوفزدہ کرنے پر خوبی اکھاڑتے ہے ہو“ وہ انتہائی غصے سے بولا۔ ”گندی مچھلیاں دلوں..... ہر دوز..... تھیں یہاں پر ہسپانیہ کے دہراتے علاقوں کی نسبت مکھیاں کم نظر نہیں آئیں؟“

”میں نے خور نہیں کیا.....“ زمان قدرے بوكھلا کر بولا۔

”غور کرو..... اپنا ہاتھ ہوا میں لہراو، کیا کوئی مکھی اس کے راستے میں حائل ہوتی ہے؟ ایک طافی کو منز میں چاگر اپنے خیمے کے سامنے رکھ دو پھر تھیں پتہ چلے گا۔“

”ہاں شاید کم ہی ہیں“ زمان نے اس کا دل رکھنے کے لیے کہہ دیا۔

”اور اس کا ذمہ دار میں ہوں.....“ بوڑھے نے رعونت سے اعلان کیا۔

زمان کچھ زیادہ ہی بوكھلا گیا۔ کچھ کھنپنے کو منز کھولا اور پھر سرلاکر ہونٹ بھینچ لیے۔

”ہاں اس کا ذمہ دار صرف میں ہوں..... پاچھ برس پہلے جب میں اس ساحلی شہر میں آیا تھا یہاں کی ہڈا میں کسی اور پرندے کے لیے اٹھے کی بھی جگہ نہ تھی۔ مکھیاں مٹھی دل کی طرح چھاتی ہوتی تھیں..... ان دلوں میں سانگھریا پریسٹوں کے گوشت کے کماڈن پر گیا تو ہاں پاچھ میری بد تینی میری کے رقبے میں ٹبے گوشت کے مکھوں پر پوری ایک سو سینتیں مکھیاں بیٹھی ہوتی تھیں میں نے خود لگیں۔۔۔“

اور اب..... قم لیکن نہیں کر دے گے..... وہ پوشاشیاً بچے میں بولا اور پھر اپنے مصروفی۔  
دانستہ بان کے سر سے سے علیحدہ کر کے انہیں کہیں حلتوں میں روپوش کرتے ہوئے  
خاموش ہو گیا..... زمان کی خاموشی پر وہ جھیلا کر کھنے لگا۔ میں کہہ رہا ہوں تم لیکن نہیں  
کر دے گے..... ”

”کس بات پر؟“ زمان نے بھی چلا کر پوچھا۔

”یہیں کہچلے ہفتے میں سانگر یا سیر شور میں گیا اور اُسی گشت کے کاموزنٹر پر  
پائچ میر بدین میر کے سبقے میں بیٹھی ہوتی مکھیوں کو شار کیا..... صرف چو میں.....  
اور اس کا ذردار میں ہوں“

”بعین آپ مکھیاں مارتے ہیں؟“

”میں انہیں بارنا نہیں۔ صرف ڈریپ کرتا ہوں اور وہ خود ہی ہر جاتی ہیں۔“

”دچس پ مشغلوں سے۔“

”مشغلوں؟“ وہ بھڑک آٹھا۔ یہیری زندگی کا نصب العین ہے۔ ایک ایسا نظام  
تام کرنا جو مکھیوں سے پاک ہو۔ مجھے مکھیوں سے شدید لذت ہے۔ یہ گندگی پھیلاتی  
ہیں۔ پیچ ذات کی یہ مخلوق اگر ایکا کر کے مخد ہو جائے تو شریف اور میر کا جلیتا  
وہ بھر کر دستی ہے۔ دوسرے جائزوں کی طرح رہا شان کا مشکلہ نہیں۔ یہ صرف  
خواراک کی متلاشی ہوتی ہیں۔ صرف پیٹ بھرنا چاہتی ہیں۔ دنیا میں ہر بُرائی کی جڑ  
مکھی ہے۔ اسے ختم کر د تو ہر طرف امن اور آشنا کا دور دورہ ہو جائے۔ دنیا  
ستھری ہو جائے۔ کارخانے چلیں۔ دولت کی ریل پیل ہو۔ جنگ کیوں ہوتی  
ہے؟ اس لیے کہ سیاست داں الیبی خواراک کھایتے ہیں جس پر مکھیاں بیٹھی ہوتی  
ہیں اور پھر ان کے معدے بگڑ جاتے ہیں اور وہ نزوں ہو کر جنگ چڑھتے ہیں۔  
اور یہ جو حادثے ہوتے ہیں سڑکوں پر۔ ڈرائیور آرام سے کار چالا زہا ہے۔ ملنے  
سے ایک اور کار آتی ہے اور بنیگ۔ ..... دونوں ڈرائیور قبیل کھاتے ہیں کہ ہم  
اپنی اپنی سامنہ پر مبنی رفتار کے اندر کار چلا رہے تھے۔ پھر حادثہ کیسے ہو گیا؟....

بہت آسان بواب ہے۔ ایک ڈرائیور کی انحصار کے سامنے سے ایک سینڈکچے یہ  
ایک عدالتی پرواز کر جاتی ہے۔ ظاہر ہے اس ایک سینڈکے لیے ڈرائیور دیکھ نہیں  
سکتا اندھا ہو جاتا ہے اور بیگ..... اور یہ جو ائے دن وہ شست پسند ہو ائی جہاز  
اخواز کرتے ہیں۔ وہ بھی صرف مکھیوں کی وجہ سے..... اور یہ ہر تالیں اور مظاہرے  
مکھیوں سے پاک نظام قائم کرنے کے لیے میرے ایسے شخص کی صورت ہے  
جو خالی پیٹ رہ کر بھی اپنے ایمان کی قوت سے اس اورش کی تجیل کر سکتا ہو۔“

پاگل پن اور کسی بھی عقیدے پر اندھا دھنڈ لیکن رکھنے کے دویان ایک پاکی  
لکھرے۔ زمان کے سامنے ہانپتا ہو ایک ایسا انسان تھا جس کے بالے میں لیکن  
سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ اس لکھر کے ادھر ہے یا ادھر جا چکا ہے۔

مُؤنیاں اور لوگ بھی میری طرح مکھیوں سے نفرت کرتے ہیں، ان کا قلع قب  
کردینا چاہتے ہیں..... بوڑھے کے ہونڈ پھر لرزنے لگے..... مگر ان کے پاس  
منا سب طریقہ قتل نہیں ہے اور میرے پاس ہے..... ایک انتہائی منظم اور ناکام  
رہونے والا سو فیصد طریقہ قتل..... میں نے ایک ایسی مشین بنائی ہے جو ایک  
گھنٹے میں پانچ سو مکھیاں قتل کرتی ہے..... یہ اوسط شرح موت ہے۔ کبھی کبھار  
پانچ سو تین تک بھی مر جاتی ہیں..... میرے ساتھ آڑا وہ اخبار سمیٹ کر اپنے آپ کو  
ایک خفیت سا جھکڑا دے کر آٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی نانگیں بھی ڈیڑھی تھیں۔ بند پر مکھیوں  
کی طرح وہ انھیں حرکت میں لا کر تین کے ان ڈبوں کی طرف گیا جو اس کے خیجے کے  
پہلو میں نصب تھے۔ مکھیاں پاگلوں کی طرح بھینجا رہی تھیں۔ ان کی سنبھانا ہڑت کی  
گونج سے زمان کے کافوں کے پرٹے لرزنے لگے۔ بوڑھے نے ایک ڈبے پر اتھا را  
اور فخر سے کھنٹا لگا۔ ایک گھنٹے میں پانچ سو مکھیاں..... اور طریقہ کار بے حد  
آسان..... مچلی ما رکیٹ سے پانچ کیوں مچلی خریدو، ان کے سر علیحدہ کر کے ان ڈبوں  
میں ڈال دو۔ چھلی کے سردوں میں سے ایک ایسی بونسلکتی ہے جو ان مکھیوں کو مسح  
کر دیتی ہے۔ وہ چاروں طرف سے منڈلاتی ہوئی اس بُوکی جانب آتی ہیں۔ اس کا

تعاقب کرتی ہر نیٹیبے کے ندر داخل ہر جاتی ہیں۔ ندر جاتے ہی دھڑپ ہر جاتی ہیں کیونکہ اب باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ آہستہ آہستہ یہ بُران کے دماغ پر اثر انداز ہونے لگتی ہے اور وہ نیم مدد ہوش ہو کر ڈبوں کے شیخے بندھے تھیلوں میں گرفتار ہیں.....”

”لیکن اس مشین کو چلانے کے لیے صرف چھپیوں کے سر در کار ہیں؟“

”.....اُس نئے مترسٹ کے انہما کے طور پر اپنے نین تعلیٰ دامت پر سے غائب کر دیئے ہیں تو ڈرپ ہے ..... عام چھپیاں نہیں مانی ذیروں ایک منسوس نسل کی چھپرٹے سروالی چھپی جس کے بارے میں اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کے سر میں سے ایک الیسی بُونکلتی ہے جو ٹھیکریوں کو مُست کر دیتی ہے۔ مگر میں جانتا ہوں چھپی ماکریٹ میں پر سے ڈھیروں میں سے میں خود انھیں پہچانتا ہوں اور ایک ایک چھپی چھپتا ہوں۔ یہ تو ڈرپ ہے：“

ٹھیکریوں کے پر ڈرپ دافعی انتہائی ہنرمندی سے بنائے گئے تھے۔ ہر ڈرپ پر ٹھیکریوں کے غول بھجننا ہے تھے۔ بوئے فنا انھیں اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ زمان نے دیکھا کہ یہ یک طرزِ ٹرینیک ہے۔ بوئے مگر ایک مرتبہ بیچے جیلی کئی سو چلی گئی۔ ڈبوں کے بیچے بندھے تھیلے بھاری ہو رہے تھے۔ بوئے صابر تھیلے کو ٹھوٹنا اور اس میں ذخیرہ شدہ انسبار پر انہارِ اہلیں کرتا۔ بُلیاں حسب سابق اس کے پہلو پہلو چل دیتی تھیں۔

”جب یہ تھیلے بھر جاتے ہیں تو میں انھیں اُنمانتا ہوں اور سرندر میں جا کر ڈبو دیتا ہوں۔“

”میرا خیال تھا کہ آپ انھیں ان بلیوں کو کھلا دیتے ہیں۔“ زمان نے کچھ کہنے کے لیے کہ دیا۔

”یہ بُلیاں .....“ وہ ایک نرم پُسی کو ٹھوکر مار کر بولا۔ یہ لاپی درندے میرا ساتھ صرف اس لیے دیتے ہیں کہ میں انھیں خوراک مہیا کرتا ہوں۔ چھپیوں کے سر تو ٹھیکریوں کو ڈرپ کرنے کے کام آتے ہیں۔ باقی تقریباً چار کلیگو شوت بیک جاتا ہے۔ ایک کیلو میں کھا جاتا ہوں اور بقیہ ان بدودش کو کھلا دیتا ہوں۔ انھیں خوراک کا لامع نہ ہو تو کبھی میرا ساختہ نہ دیں۔“

تو زکیا آپ کے بیہاں آنے سے پیشتر ساری بلیاں بھجوں کوں مرتی تھیں؟ زمان نے پھر پاٹھی۔

”بھی تو طریق ہے.....“ وہ پھر اپنی بے دامت مسکرا ہٹ نایاں کر کے بولا۔ میرے بیہاں آنے سے پہلے یہ ماری چورتی تھیں۔ خراک کے لیے جدوجہد کرتی تھیں، گраб یعنی ہو گئی ہیں، اسکست ہو چکی ہیں۔ یہ بھجوں تک ہیں کہا پنچھوں سے کوڑا کر کٹ بھیر کر اُس میں سے خراک کیسے حاصل کی جاسکتی ہے۔ باہ ان کی زندگی کا اختصار صرف بھجوں پر ہے میکن میں اُخیں یونی کھانے کو نہیں ملے دیتا۔ میزیں و مچھلیوں کے دھڑکنہ دیتا ہوں اور یہ بھجوں سے مجبور اس کے گرومنڈلا تی رہتی ہیں۔ مگر میں اُخیں کھانے نہیں دیتا۔ اُخیں بھجوں کا رکھنا ہوں ایک خاص وقت تک۔ ایک ایسے تھجھ تک جب اگر میں خراک نہ دوں تو یہ بھجوں ملاد اور ہو جائیں۔ جانتے ہو کیوں؟“

”کیوں؟“ زمان نے فرماتھیں کی۔

”اس لیے کہ میرے بدن میں بھی اب مچھلی کی بو ہے ہیں خدا ایک مچھلی ہوں ذرا سمجھو۔“ اس نے زمان کی ناک کے آگے اپنا سینچل دار بازو دکر دیا۔ ہاں اُس میں بُوقنی مچھلی کی ہواں قریں کہہ رہا تھا کہ میں اُخیں ایک آخری لمحے تک بھجوں کا رکھنا ہوں کہ اُس وقت اگر اُخیں کھانے کو نہ ملے تو یہ بھجوں کو فوح ڈالیں اور اُس آخری لمحے کی پہچان بھی صرف بھی کرے۔ اُس وقت ان کے نکو سے ہوتے و انتہ پر جیوانی جذبے پوری شدت سے چکٹ اٹھتے ہیں۔ ان کی غراہٹ کارنگ بدلت جاتا ہے۔ اُخیں پوری کھل جاتی ہیں اور پھر ایک بُل آگے بڑھ کر میرے بوٹ پر دامت لگاڑ دیتی ہے۔ تب میں ان کے درمیان مچھلیوں کے دھڑکنیک دیتا ہوں۔“ بڑھے نے نفرت سے اپنے بازوؤں پر بھلکی کی اور اُس کی بھلکی اترنے لگی۔ میل کے سینچے بھی مچھلی کے چانوں کی طرح کے کھرندہ ہجھے ہوئے تھے۔

”کیا یہ خلناک ثابت نہیں ہو سکتا۔“ اگر آپ اُس آخری لمحے کی پہچان نہ کر پائیں، چند سینکڑوں کی دیر کر دیں تو؟“